بَدَءُ الْاِسْلَامُ میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں

قرآنِ حکیم اور جہاد فی سبیل اللّٰہ

قرآن: منبع وسرچشمۂ ایمان ویقین' اور جہاد: ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اتمّ

واقعہ یہ ہے کہ بدءُ الاسلامؒ میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں۔ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدّ وجہد کے ضمن میں آلۂ انقلاب کی حیثیت حاصل ہے بقول مولانا حالیؔ

اتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا   اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپ ﷺ کی اس جدو جہد کے مختلف مدارج ومراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآنِ مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔چنانچہ "وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ o" کی چونکا دینے والی صدائیں اور "اَلْقَارِعَةُ o مَاالْقَارِعَةُ o وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْقَارِعَةُ o" اور "اَلْحَآقَّةُ مَاالْحَآقَّةُ o وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْحَآقَّةُ o کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنھوں نے پورے عرب میں ہلچل مچادی اور "عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ o عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ o الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ o" کی کیفیت پیدا کردی۔بقول مولانا حالیؔ

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ   عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر......اِسی کی آیاتِ بیّنات تھیں جنھوں نے هُوَ الَّذِیْ يُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ o (الحدید:9) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادّہ پرستی، حبِّ عاجلہ، اور حیوانیّتِ محضہ کے "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبتِ خداوندی اور سرشاریعنی مستِ بادۂ الست ہو گئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پَر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کلّیۃً طالبِ عقبٰی بن گئے۔مزید برآں......وہی تھا جو "مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" بھی بن کر آیا، اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" بھی! چنانچہ اُسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب وتجلیۂ روح بھی! گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر......الغرض تطہیر ہو یا تعمیر محمد رّسول اللہ ﷺ کا پورا عملِ دعوت واصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضور ﷺ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل وآخر خود قرآنِ مجید ہی ہے۔بفحوائے الفاظِ قرآنی:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:2)

سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت!

قرآن کا کارنامہ ایک جملے میں بیان کیجئے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرامِ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کردی۔لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اِس لئے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، امنگیں بدلیں، شوق بدلے، دل چسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیت بدلی، اجتماعیت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتّٰی کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی......اور اس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات! بقول علامہ اقبالؒ:

بندۂ مومن زِ آیاتِ خداست   ایں جہاں اندر برِ او چوں قباست!

چوں کہن گردد جہانے در برش   می دہد قرآن جہانِ دیگرش!

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازمًا تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیت اور مقدار کی نسبت سے کم وبیش ہو سکتے ہیں۔ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج ومراحل کا جامع عنوان ہے 'جہاد فی سبیل اللہ'۔

اِس تصادم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیا۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکّک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں' سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش کی صورت میں ہوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربّ' یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیّت مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تا کہ ''اُس کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو!''......اور اِس کی آخری منزل ہے ''قتال فی سبیل اللہ'' جس کا منتہائے مقصود معیّن ہوا ان الفاظ میں کہ:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:39)

''اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک کہ ''فتنہ'' بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت کلّیۃً اللہ ہی کے ہونے لگے!''

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزوم باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات:15)

''مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول ﷺ پر پھر شک میں نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال اور اپنی جانیں حقیقت میں یہی ہیں سچے!''

واضح رہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں 'حقیقی ایمان' اور 'قانونی اسلام' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں' جہاد اور قتال ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں' چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (Symbols) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیّل اور تصور میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں!

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران اسلام کی 'نشأۃِ اُولیٰ' یا غلبۂ دینِ حق کا دَورِ اوّل بلا شائبہ ریب و شک' نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلق قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے 'ظاہر' سے ہوتی ہے' باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علامہ اقبال ''بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!''......مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے عفو پر مقدم ہو جاتا ہے......اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اُصولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے، اصولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دَور میں داخل ہوا تو اصل زور (Emphasis) ایمان کے بجائے اسلام پر' یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از ادلۂ اربعہ ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے چلے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو 'چار میں کے ایک' کی حیثیت میں پس منظر میں گم، ہوتا چلا گیا اور توجّہات حدیث اور فقہ پر مُرتکز ہو کر رہ گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجتاً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوّف کی آماجگاہ بن کر رَہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اُصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت...... بلکہ صرف ایسی ''کتابِ مقدّس'' بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آ سکتے ہیں۔ اور اس طرح آنحضور ﷺ کی وہ پیشن گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ: کتاب العلم)

''اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا''

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہوگیا تو جہاد بھی ایمانِ حقیقی کا رکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجّہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہوگئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے، گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ 'چار میں کے ایک' کی حیثیت ہی سے سہی بہرحال شریعت کے اصولِ اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصور بھی مسخ ہوگیا اور اس شجرۂ طیّبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (Short cut) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زُور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جدّ وجہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ...... گویا فی الجملہ احقاق حق اور ابطالِ باطل کی منظّم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہوگئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! ''ببیں تفاوتِ راہ از کُجاست تا بہ کُجا!'' کے مصداق کُجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

کُجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک مُتَنبّی اور اُس کی ذرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بِالسّیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

''کہ رہوار یقینِ ما بصحرائے گماں گُم شد!''